

Article

A Historical and Critical Review of Saadat Hassan Manto's Short Stories Translations in Balochi

بلوچی میں سعادت حسن منٹو کے افسانوں کے تراجم کا تاریخی و تنقیدی جائزہ

¹Dr. Rahim Bakhsh Mehr, ²Abdul Raziq, ³Dr. Muhammad Sadiq Saba

¹Associate Professor, Controller of Examinations, University of Gwadar.

²Lecturer, Department of Pakistani Languages, NUML, Islamabad.

³Assistant Professor, Institute of Balochi Language and Culture (IBLC), University of Turbat.

Correspondence: merhkulanchi@gmail.com

ڈاکٹر رحیم بخش مہر، عبدالرازق^۳ ڈاکٹر محمد صادق صبا

ایبوسی ایٹ پروفیسر، کنٹرولر آف امتحانات، جامعہ گوادر، الیکٹران، شعبہ پاکستانی زبانیں، نمل، اسلام آباد

اسسٹنٹ پروفیسر، انسٹیٹیوٹ آف بلوچی لینگویج اینڈ کلچر، جامعہ تربت

ABSTRACT

The translation of short stories from various languages into Balochi has played a pivotal role in shaping modern Balochi literature, with Urdu being a particularly significant source language. Among the prominent Urdu writers, Saadat Hasan Manto stands out as a revolutionary figure whose works have profoundly influenced Balochi literary traditions. Manto's short stories, renowned for their social realism and bold exploration of human conditions, have been widely translated into Balochi, enriching the target language with new semantic features and cultural depth. This research paper delves into the historical and artistic analysis of Manto's short stories translated into Balochi, examining the techniques employed by translators, such as deletion and addition, to bridge linguistic and cultural gaps. By exploring the interplay between the source and target languages, the study highlights how Manto's themes of societal critique and human resilience are preserved and adapted in Balochi translations. The paper also underscores the broader implications of such translations in fostering cross-

eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210
Received: 07-03-2025
Accepted: 01-07-2025
Online: 31-07-2025



Copyright: © 2025
by the authors.

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

cultural literary exchanges and preserving the essence of revolutionary narratives in Balochi literature.

KEYWORDS: Biography, History, Events, Style, Personality, Attitude, Criticism, Basics

سعادت حسن منٹو اردو افسانے کے دبستان میں اپنی انفرادی شناخت، منفرد طرزِ اظہار اور جداگانہ اسلوب کے باعث ایک بلند پایہ مقام رکھتے ہیں۔ ۱۱ مئی ۱۹۱۲ کو لدھیانہ میں پیدا ہونے والے منٹو کو ابتدا ہی سے مطالعے اور تخلیق کا گہرا شغف تھا، جس نے انہیں عمر بھر قلم و قرطاس سے وابستہ رکھا۔ تیس کی دہائی میں جب انہوں نے ادبی سفر کا آغاز کیا، توری اور فرانسسیسی ادب کے شاہکاروں کا مطالعہ اور ترجمہ ان کے فکری ارتقا میں سنگِ میل ثابت ہوا، خصوصاً چیخوف اور موباساں کے فن نے ان کے ابتدائی اسلوب پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری اور جزئیات نگاری کے عناصر نہایت واضح نظر آتے ہیں، جو بعد میں ان کے فنی رویے کا بنیادی حوالہ بنے۔

منٹو کے افسانے اپنی تہہ داری، آشوب پسندی اور رومانویت کے امتزاج کے باعث ایک مخصوص جمالیاتی و فکری جہت کے حامل ہیں۔ ان کے عہد میں رائج ادبی نظریات اور روایات کے باوجود انہوں نے ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جو نہ صرف ان کے ہم عصروں سے منفرد تھا بلکہ اردو افسانے میں ایک نئی جہت کا اضافہ بھی تھا۔ ان کے فن کا نمایاں جوہر اختصار پسندی ہے، جو ان کے بیانیے کو غیر ضروری تفصیلات سے بے نیاز رکھتی ہے۔ اگرچہ ابتدائی افسانوں میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری کا رجحان نمایاں ہے، تاہم بعد کے افسانوں میں وہ منشی پریم چند اور کرشن چندر جیسے افسانہ نگاروں کے برعکس غیر ضروری تفصیل سے گریز کرتے ہوئے سادہ، سپاٹ مگر بلیغ بیانیے کو ترجیح دیتے ہیں۔ انہوں نے استعارہ، علامت اور تمثیل کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو افسانے میں ایک نئے طرزِ احساس کی بنیاد رکھی، جس نے اردو فکشن کو نہ صرف نئے موضوعات سے روشناس کرایا بلکہ اس کے فکری اور اسلوبیاتی امکانات کو بھی وسعت دی۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کا فن اردو افسانے کے دبستان میں ایک نئے باب کا استعارہ بن چکا ہے۔

منٹو ایک ہنگامہ خیز اور پر آشوب دور میں تخلیق کاری کر رہے تھے، جب پورے برصغیر سمیت دنیا کے مختلف خطوں میں آزادی کی جدوجہد اپنے عروج پر تھی۔ انگریز استعمار کے خلاف برصغیر میں سیاسی اور فکری مزاحمت جاری تھی، اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادیب و شاعر انقلابی رومانویت اور حقیقت پسندی کے امتزاج کے ساتھ جابر قوتوں کے خلاف قلمی جہاد کر رہے تھے۔ منٹو بھی اس فکری اور تہذیبی کشمکش سے الگ نہ تھے، ان کے افسانوں میں آزادی، انقلاب اور سماجی طبقات کے تصادم جیسے موضوعات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ خصوصاً تقسیم ہند کے لیے اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات کے پس منظر میں انہوں نے ایسے شاہکار افسانے تخلیق کیے جو اردو فکشن میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہی کی بدولت انہیں دوام نصیب ہوا۔

سعادت حسن منٹو اردو کے ان چند نڈر اور راست گو افسانہ نگاروں میں شامل ہیں، جنہوں نے اپنی تخلیقات میں معاشرتی جبر، منافقت اور طبقاتی ناہمواریوں کو بے نقاب کیا۔ ان کی بے باک تحریروں کے باعث ان پر کئی مقدمات قائم کیے گئے اور انہیں عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑے، مگر وہ اپنی فکر و اظہار میں کسی خوف یا مصالحت کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے ان کرداروں اور موضوعات کو اپنا محور بنایا، جو عمومی طور پر معاشرتی بے حسی کا شکار تھے اور نظر انداز کر دیے جاتے تھے۔ ان کے فن کی سب سے بڑی انفرادیت یہ تھی کہ وہ کرداروں کی ظاہری ہیئت اور حرکات سے زیادہ ان کے باطنی و نفسیاتی پیچیدگیوں اور ذہنی کشمکش کو بے کم و کاست بیان کرتے تھے۔ یہی وہ فنی جہت ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

منٹو نے افسانے کے فن میں کئی اسلوبیاتی اور تکنیکی تجربات کیے اور اپنے بیانیے میں نئی جہات متعارف کرائیں۔ افسانہ نگاری کے علاوہ انہوں نے فلم، ڈرامے اور خاکے بھی تخلیق کیے، جب کہ ان کے فکری و تنقیدی مضامین بھی اردو نثر کا ایک اہم باب ہیں۔ اردو زبان و ادب کا یہ بے مثال افسانہ نگار ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا، مگر ان کا فن آج بھی اردو ادب میں ایک توانا آواز کی صورت زندہ ہے۔

بلوچی میں افسانوں کے تراجم کی روایت جدید ادب کے ابتدائی عہد میں پروان چڑھی۔ بلوچی کا اولین ادبی مہنامہ اومان ۱۹۵۱ء میں منظر عام پر آیا، جس نے شاعری و نثر میں نئے اسالیب اور تجربات کی بنیاد رکھی۔ اس دور کے بیشتر اہل قلم فکری طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے، یہی سبب ہے کہ ابتدائی تراجم میں انہی نظریات کے حامل افسانہ نگاروں کے تخلیقی شاہکار شامل کیے گئے۔ بلوچی میں ترجمہ ہونے والا پہلا افسانہ میکسم گورکی کا تھا، اور جدید بلوچی ادب کی اولین دہائی میں ترقی پسند ادب کے نمایاں افسانہ نگاروں کے تراجم کار ججان غالب رہا۔ اسی تناظر میں اردو کے کرشن چندر، رام لال، منشی پریم چند اور دیگر ترقی پسند ادیبوں کے افسانے بھی بلوچی قالب میں ڈھالے گئے۔

سعادت حسن منٹو کے افسانے نسبتاً تاخیر سے بلوچی میں منتقل کیے گئے۔ ان کا پہلا ترجمہ عزیز بگٹی نے ۱۹۷۷ء میں کیا، جب ان کا افسانہ مزوری کے عنوان سے ماہنامہ 'الس' (۱) کے جنوری شمارے میں شائع ہوا۔ اسی ماہنامے کے فروری ۱۹۷۷ء کے شمارے میں ان کا دوسرا ترجمہ ٹیپو سلطان مرک (۲) کے عنوان سے منظر عام پر آیا تو دیکھا جائے تو بلوچی میں افسانوں کے تراجم کی روایت ۱۹۵۰ء کی دہائی میں مستحکم ہو چکی تھی، مگر منٹو کے تراجم کا آغاز ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اواخر میں ہوا۔ اس تاخیر کے اسباب میں بنیادی طور پر دو عوامل کار فرما دکھائی دیتے ہیں: اول، یہ عمومی تاثر کہ منٹو محض فحش نگار ہیں نہ کہ سماجی حقیقت نگار، دوم، بلوچی کے ابتدائی مترجمین کا زیادہ رجحان ان افسانوں کی طرف تھا جو ترقی پسند نظریات اور سماجی حقیقت نگاری کے منظر تھے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں بھی منٹو کے تراجم کا سلسلہ محدود رہا اور محض تین افسانے بلوچی میں منتقل کیے گئے، جن میں خالد در محمد فدائی

کاخورشید، علی عیسیٰ کاماھیک کش اور احمد علی ظفر کا ونڈ شامل ہیں۔ تاہم، ۱۹۹۰ کی دہائی میں منٹو کی طرف مترجمین کی خصوصی توجہ مبذول ہوئی اور ان کے متعدد افسانے بلوچی میں منتقل کیے گئے۔ یہ رجحان اتنی سرعت سے پروان چڑھا کہ موجودہ دور میں اردو کے سب سے زیادہ ترجمہ ہونے والے افسانہ نگار منٹو بن چکے ہیں۔ ان کے تراجم بلوچی کے ممتاز اہل قلم نے کیے ہیں، جن میں نموش بخش صابر، اے آرداد، گلزار گنجی، چراگ لاشاری، گوہر اقبال بالی، شرف شاد، رؤف راز، صادق مراد، نور خان بزنجو اور دیگر شامل ہیں۔

بلوچی میں منٹو کے جن معروف افسانوں کے تراجم ہوئے ہیں، ان میں ماہیگیر، آنکھیں، پرشتے، موجدین، ٹھنڈا گوشت، ٹوبہ ٹیک سنگھ، رشوت، کھول دو، تماشہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ منٹو کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، تاہم ان کی اصل پہچان ان کے منتخب افسانے ہیں، جن میں سے بعض کے بلوچی تراجم ہو چکے ہیں جبکہ کچھ ہنوز باقی ہیں۔

بلوچی مترجمین کے ہاں منٹو کے تراجم کے دور جہانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک وہ مترجم جو فن ترجمہ سے آگاہی رکھتے ہیں اور جنہوں نے منٹو کے معروف افسانوں کو فنی مہارت اور اصل اسلوب و طرز نگارش کے التزام کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ دوسرا وہ طبقہ ہے جس نے نہ تو انتخاب میں احتیاط برتی اور نہ ہی ترجمے کے فنی تقاضوں کا لحاظ رکھا، جس کے باعث ان کے ہاں سطحیت اور فکری ناپختگی نمایاں ہے۔ سعادت حسن منٹو اور دو افسانے کے ایک منفرد تخلیق کار ہیں، جن کی انفرادیت ان کے مخصوص طرز اسلوب میں مضمر ہے۔ ان کے ہاں اختصار کی صنایع نمایاں ہے، اور ان کے افسانوں کے موضوعات انسانی زندگی کے سطحی مظاہر کے بجائے اس کی داخلی کیفیات، نفسیاتی پیچیدگیوں اور ذہنی اضطراب کو تخلیقی جہت دے کر پیش کرنے سے عبارت ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریر سادہ بیانیہ کے بجائے رمز و اشارت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور علامتی و استعاری پیرایہ اظہار میں ڈھل جاتی ہے۔ منٹو کے کئی افسانے اسی علامتی و استعاری اسلوب کے مظہر ہیں، جن میں کھول دو ایک اہم مثال کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس افسانے کو عزیز بگٹی نے بلوچی میں ترجمہ کیا، جو ان کے افسانوی مجموعے تراتانی کشار میں شامل ہے۔ (۳)

کھول دو بر صغیر کی تقسیم اور فسادات کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں نہ تو طوالت ہے اور نہ ہی روایتی واقعاتی رنگ، بلکہ یہ ایک ایسے واقعے کا نفسیاتی پہلو اجاگر کرتا ہے جو اپنے عہد کے اجتماعی لاشعور کا استعارہ بن چکا ہے۔ طاہرہ اقبال کے بقول، یہ کہانی اختصار اور بلاغت کی بہترین مثال ہے، محض تین صفحات پر مشتمل اس تحریر میں ایک انسانی المیے کو گہرے رنج و الم کے پس منظر میں اس کر بناک سچائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ قاری پر اس کی گونج دیر تک باقی رہتی ہے۔ (۴) اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کی رمزیت اور اشاراتی طرز بیان ہے، جہاں مصنف نے تفصیل و جزئیات کے بجائے چنیدہ الفاظ کی تاثیر سے ایک ایسا تاثر قائم کیا ہے کہ اختتامیہ پر ایک نئی کہانی جنم لیتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ منٹو کی فنی مہارت ہے کہ وہ قاری کو ایک ایسے شاہراہ پر چھوڑ دیتے ہیں جہاں سے سوچ کے نئے درواہ ہوتے ہیں اور نئی منزلوں کی طرف سفر کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ کھول دو فسادات کے پس منظر میں لکھا جانے والا وہ

شاہکار ہے جو دیر تک اپنے قاری پر اثر انداز رہتا ہے۔

عزیز بگٹی نے نہ صرف کھول دو بلکہ منٹو کے کئی دیگر افسانے بھی بلوچی میں منتقل کیے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ خود ایک افسانہ نگار ہیں اور اس فن کی باریکیوں سے بخوبی آگاہ ہیں، لیکن ان کے تراجم میں وہ فنی امتیازات نظر نہیں آتے جو ان کے طبع زاد افسانوں میں نمایاں ہیں۔ تخلیقی تحریر، چاہے ترجمہ ہو یا اصل تخلیق، اس کا جوہر زبان و بیان اور اسلوب میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ تاہم، بگٹی کے تراجم کے مطالعے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ان کی تحریر میں ترجمہ شدہ متن کی اصل زبان کی اثر انگیزی اور اسلوبی رنگ معدوم دکھائی دیتا ہے۔ وہ تخلیقی ادب کا ترجمہ بھی محض علمی مواد کی طرح کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ٹیکسٹ تو دوسری زبان میں منتقل ہو جاتا ہے، مگر اس کے تہذیبی، معنوی اور اسلوبی امکانات پوری طرح ابھرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

منٹو کے افسانے کھول دو کے ترجمے کے مطالعے سے بھی یہی امر عیاں ہوتا ہے کہ مترجم نے لفظی ترجمے کی روش اختیار کی ہے اور بعض مقامات پر حذف کی تکنیک برتی ہے۔ جہاں کہیں کوئی مکالمہ یا پیرا گراف ان کی فکری دسترس سے باہر محسوس ہوا، وہاں انہوں نے اسے ترجمے کے عم ل میں شامل کرنے کے بجائے حذف کر دیا۔ اس طرح اصل متن کے معنوی امکانات اور اسلوبی رنگ اپنی پوری قوت کے ساتھ ٹارگٹ لینگویج میں منتقل نہ ہو سکے۔ لفظی ترجمے اور حذف کی اس روش کی ایک مثال افسانے کے درج ذیل اقتباس سے دی جاسکتی ہے:

”امر تر سے اسپیشل ٹرین دوپہر کے دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی۔ راستے میں کئی آدمی مارے گئے۔ متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر ادھر بھٹک گئے۔ صبح دس بجے کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں اور بچوں کا متلاطم سمندر دیکھا تو اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہو گئیں اور وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے، اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے۔ مگر اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں تیز روشنی اس کے وجود کے سارے ریشوں میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے دماغ میں کئی تصویروں دوڑ گئیں۔ لوٹ، آگ، بھاگم بھاگ، اسٹیشن، گولیاں، رات

اور سکینہ! سراج الدین ایک دم کھڑا ہو گیا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کر دیا۔“ (۵)

منٹو کے اس افسانے کے ابتدائی پیرا گراف کے بلوچی ترجمے میں مترجم نے لفظ بہ لفظ ترجمے کی تکنیک اپناتے ہوئے کئی جملوں کو حذف کر دیا ہے، حالانکہ اصل کہانی میں یہی جملے اس کے معنوی تاثر کی شدت کو ابھارنے کے لیے پیش کیے گئے تھے۔ منٹو کی اس تحریر میں توضیحات اور جزئیات نگاری سے اجتناب برتا گیا ہے، اور الفاظ کے چناؤ میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ تاہم، ترجمے کے دوران ان نازک احساسات اور گہرے جذبات کو حذف کر دینے کے سبب اصل کہانی کی فنی خوبیاں ہدفی زبان میں مکمل طور پر منتقل نہ ہو سکیں۔ بلوچی ترجمہ کچھ یوں ہے:

”خا صیں ریل روش ء دو وجاء شہ امر تسر ء رائی بیشہ او ہشت کلاک آں رند م غلام پورہ ء سر بیٹہ۔ دگ ء بازیں مڑ دم کش جیشغنت، بازیں ٹپی میشغنت او بازیں گار میشغنت۔ داں دیرے ء آ نہی نیاہ آ زمان ء سراعے۔ جناں تہ ہر تک ء مڑ دم آنی کو کاراٹ۔ پر ہیریں سراج دین ء گوش بزاں بند امنٹ۔ آں بچ توارے اش نہ کنغائٹ۔ مڑ دماں چوں مان آتک کہ آں من گزرتی ءے ایں۔ ہر چوش نہ یٹ آ نہی ہوش بزاں سیبت نیٹاں۔ مڑیں آ زمان ء سراعے ء چوں گندانا سراج دین ء نیاہ روش ء سراعے پد تہ غماں۔ بازر ٹنیں ر م ب و تش ٹیشن تیر گواری شف او سکینہ سراج دین ء ناغمائی ء در کو داٹو کڑو بیٹہ او گنو خانی ڈول ء مڑ دم آنی مچی ء بزاں کسے ء پو لغ بنا کشئی۔“ (۶)

منٹو کے اردو متن کے کئی نشان زدہ جملے بلوچی ترجمے میں شامل نہیں کیے گئے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مترجم نے یہ تکنیک دانستہ اختیار کی ہے۔ حذف کی اس روش کے سبب نہ صرف منٹو کا مخصوص اسلوب اور طرز اظہار بلوچی میں پوری طرح منتقل ہونے سے قاصر رہا بلکہ کہانی کی معنوی شدت بھی کمزور پڑ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کے دیگر مترجمین، شرف شاد اور جمیل امام، نے اسے بچ کن کے عنوان سے بلوچی میں ڈھالا، اور ان میں شرف شاد کا ترجمہ نسبتاً بہتر محسوس ہوتا ہے۔ عزیز بگٹی نے منٹو کے مزید دو افسانے بھی بلوچی میں ترجمہ کیے ہیں، جو ان کی افسانوی کتاب نو دور گام میں نوخیز قانود اور مزوری کے عنوان سے شامل ہیں۔

منٹو کے کئی افسانے دو دو یا تین تین مرتبہ بلوچی میں ترجمہ ہو چکے ہیں، جن میں ان کا مشہور افسانہ ٹھنڈا گوشت بھی شامل ہے۔ یہ افسانہ انہوں نے برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان آ کر تخلیق کیا تھا، اور اس کی اشاعت کے بعد ان پر فحش نگاری کا الزام لگا، جس کے نتیجے

میں انہیں عدالتوں کے چکر بھی کاٹنے پڑے۔ ٹھنڈا گوشت دراصل تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کے پس منظر میں ایک گہرے سماجی المیے کو آشکار کرتا ہے۔ ایک ایسا المیہ جو انسانی امن پسندی پر ایک بد نما دھبے کی مانند ہے۔ ایسے نازک اور حساس موضوعات کو جس جرأت اور بے باکی سے منٹو نے قلم بند کیا، وہ ان کی انفرادیت کا ثبوت ہے۔

منٹو کا فنی کمال کہانی کے مواد کی نفسیاتی گہرائی کے ساتھ اس کے اسلوبیاتی برتاؤ میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں کہانی کی ٹریٹمنٹ، اس کا پلاٹ اور ترکیب، سب ان کے مخصوص بیانیے اور اسلوب کے مطابق ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

ٹھنڈا گوشت کے دو بلوچی تراجم سامنے آتے ہیں: بشیر احمد نے اسے برپیں جون جبکہ گوہر اقبال بالی نے سردیں جون کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔ بشیر احمد نے اسے لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا، جس کی وجہ سے کہانی کی اصل روح اور اس کے معنوی امکانات بلوچی میں پوری طرح منتقل نہ ہو سکے۔ اس کے برعکس، گوہر اقبال بالی نے با محاورہ ترجمے کی روش اپنائی، جس سے نہ صرف کہانی روان اور سلیس ہو گئی بلکہ وہ معنوی طور پر بھی اصل متن سے قریب تر رہی۔

اس فرق کو واضح کرنے کے لیے اردو کے درج ذیل پیرا گراف کو دونوں مترجمین کے ہاں بلوچی روپ میں ملاحظہ کریں:

”کلوٹ کو رہے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کو لہے تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھر پور کچھ زیادہ ہی اوپر کو اٹھا ہوا سینہ، تیر آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار، ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑے کی عورت ہے۔“ (۷)

اردو متن کا بلوچی ترجمہ بشیر احمد کے ہاں کچھ اس طرح ملتا ہے:

”کلوٹ کو رہے گوشتیں دست پادیں جینے ات۔ آئی بڑگوشت گوشت ناک ات انت، سینگ دیم در آنگگ ات، چمے پر کشش ات انت۔ سری لٹ و برزی نیمگ و کسان کسانیں مود سز بیگ ات انت، آئی ز نوک ہے پد رنگ و انت کہ مزن جو نین جینے۔“ (۸)

جبکہ گوہر اقبال بالی کے ہاں اس کا بلوچی ترجمہ کچھ یوں ملتا ہے:

”کلوٹ کو رہے ز نڈیں جینے ات، آئی و مز نین دست و پاد و بزیں بززان کے گیسق مکیں دل بند، تر پو کیں چم، سر بری لٹ و سر اپٹانی یک سر مگیں غبار و ز نوک و وڑ و پیم و چہ پد ربوت کہ ایک سانڈیں جینے ات۔“ (۹)

منٹو کے اس افسانے میں کلوٹ کو رہے کا تعارف نہایت اختصار اور چنیدہ لفظوں میں پیش کیا گیا ہے، جس سے نہ صرف اس کے

ظاہری خدوخال بلکہ اس کی داخلی شخصیت اور فطرت کے خدوخال بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہی اختصار اور گہرائی منٹو کے اسلوب کی پہچان ہے۔ بشیر احمد کے ترجمے میں یہ معنوی شدت اور اثر پذیری مکمل طور پر منتقل نہیں ہو پائی، کیونکہ انہوں نے بعض مقامات پر ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو اصل متن کی معنوی گہرائی کو مکمل طور پر نہیں سمو پاتے۔ اس کے برعکس، گوہر اقبال بانی کا ترجمہ اصل متن سے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے اور معنوی سطح پر بھی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

منٹو کا ایک اور معروف افسانہ ماہیگیر ہے، جسے علی بلوچ نے ماہیگیر کش (۱۰) اور فضل کریم نادر نے ماہیگیر کے عنوان سے بلوچی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کہانی منٹو نے فرانسیسی ادیب و کٹر ہیوگو کی ایک نظم سے متاثر ہو کر تخلیق کی تھی۔ علی بلوچ کا ترجمہ خالص بلوچی محاورے اور ساحلی زبان کے مزاج میں ڈھلا ہوا ہے۔ انہوں نے کہانی میں استعمال ہونے والے بحری اصطلاحات، ماہی گیری کے اوزار اور سمندری زندگی کے عناصر کو نہایت خوبصورتی سے بلوچی میں منتقل کیا ہے۔ ان کا ترجمہ آزاد اسلوب میں ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف کہانی کی معنوی جہات برقرار رہتی ہیں بلکہ اس کا اسلوب بھی فطری اور روانی سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

گلزار گنجی نے بھی منٹو کے تین افسانے بلوچی میں ترجمہ کیے ہیں، جن میں آپٹک (۱۱) (شلاجم کا ترجمہ) ماہتاک بلوچی، اپریل ۱۹۹۲ء، ہیڈ (۱۲) ماہتاک بلوچی، فروری ۱۹۹۶ء، اور پلانی پنڈل (۱۳) ماہتاک بلوچی، اگست ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئے۔ آپٹک، جو مکالماتی انداز میں لکھی گئی کہانی ہے، کو گلزار گنجی نے نہایت سادہ اور رواں زبان میں ترجمہ کیا ہے، جس کے سبب قاری کو کہیں بھی ابلاغ کی الجھن محسوس نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کا اسلوب اور تخلیقی رنگ اس ترجمے میں جوں کا توں برقرار رہتا ہے۔

بلوچی نثر کے معروف مترجم اے آر داد نے بھی منٹو کے دو افسانے اسپ گاڑی (ماہتاک بلوچی، اگست ۱۹۹۲ء) اور چم (آساپ، اپریل ۱۹۹۳ء) کے عنوان سے ترجمہ کیے ہیں۔ اے آر داد کے تراجم کی نمایاں خصوصیت ان کی آزاد اسلوبی تکنیک ہے، جس کے سبب ترجمہ تخلیقی رنگ لیے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔ ان کے تراجم میں نہ صرف ابلاغ کی روانی برقرار رہتی ہے بلکہ قاری کو متن کے مفہوم کو سمجھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا، یہی سبب ہے کہ ان کے ترجمے تخلیقی ادب کے قریب تر محسوس ہوتے ہیں۔

”وہ برقعہ پہنے ہوئے تھی، مگر نقاب اٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دوایا ایک بوتل تھی اور وہ

جزل وارڈ کے برآمدے میں ایک چھوٹے سے لڑکے کے ساتھ چلی آرہی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جو بڑی تھیں نہ چھوٹی، سیاہ تھیں نہ

بھوری، نیلی تھیں نہ سبز، ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ میرے قدم رک گئے۔ وہ بھی

ٹھہر گئی۔ اس نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا ”تم سے

چلا نہیں جاتا!“

لڑکے نے اپنی کلائی چھڑائی اور تیزی سے کہا ”چل تو رہا ہوں..... تو تو اندھی ہے!“
میں نے یہ سنا تو اس لڑکی کی آنکھوں کی طرف دوبارہ دیکھا۔ اس کے سارے وجود میں صرف
اس کی آنکھیں ہی تھیں جو مجھے پسند آئی تھیں۔“ (۱۴)

افسانے کے اس حصے کا با محاورہ ترجمہ بلوچی میں یوں ہے:

”آئی ءبرقعہ سرات بلے دیمگ نے برزات آئی ءدست ءدرمان ء شمشگے ات ء آجزل وارڈ ء
کمپان ء گوں گوئس بچکے ء پیداک ات، من آئی ء نیمگ ء چارات آئی ء چم زنڈات انت، نے
کسان، سیاہ ات انت نے ناسی، زاگلی ات انت نے زرد۔ یک دگہ ڈولیں رٹنے ششم ات۔ منی
پاداں جواب دات۔ آہم اوشنات۔ آئی ء وتی ہمہر آئیں بچک ء دست گپت ء لرزنگیں زبان
گشت ءے گوں توروگ نہ بیت!“

بچک ء وتی دست ژپ ات ء پسودات من و پیداکاں تو کورے!“ من اے اشکت تہ جنک ء

چمانی نیمگ ء پد اچارات آئی ء سر ہمیں متاہ چم ات انت کہ منادوست ات انت۔“ (۱۵)

اے آرداد نے منٹو کے دونوں افسانوں کو خالص اور سلیس زبان میں با محاورہ انداز میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے ترجمے کی خاص
بات یہ ہے کہ وہ زبان کی سادگی اور رواں اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے اصل متن کے مفہوم اور اثر کو مکمل طور پر منتقل کرنے میں
کامیاب رہے ہیں۔ ان کے تراجم نہ صرف با محاورہ ہیں بلکہ تخلیقی رنگ بھی رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے قاری کو متن کی تفہیم میں کسی قسم کی
دقت محسوس نہیں ہوتی اور کہانی کی اصل فضا اور جذبات اپنی پوری شدت کے ساتھ برقرار رہتے ہیں۔

حال ہی میں مجاہد زاہد نے منٹو کے منتخب افسانوں کا بلوچی میں ترجمہ کر کے منٹو ء آزمانک (منٹو کے افسانے) کے عنوان سے ایک
کتاب مرتب کی ہے، جو ملا اسمائیل لبرائکی گل پلاباد کی جانب سے جولائی ۲۰۲۳ میں شائع کی گئی ہے۔ اس کتاب میں منٹو کے پندرہ افسانے
شامل ہیں، جن میں چند غیر معروف کہانیوں کے ساتھ بعض شاہکار افسانے بھی موجود ہیں، جیسے ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، شاہ دولہ کا چوہا اور
بو۔

اس کتاب کی اہمیت اس لحاظ سے نمایاں ہے کہ اس نے بلوچ قارئین کو ان کی اپنی زبان میں منٹو کے لازوال افسانے پڑھنے کا
موقع فراہم کیا ہے۔ مجاہد زاہد نوجوان لکھاری ہیں اور ان کا ترجمہ کی طرف رجحان ایک خوش آئند امر ہے۔ ان کے بیشتر تراجم لفظ بہ لفظ
تکنیک پر مبنی ہیں، لیکن چونکہ ان کی سوریس لینگویج پر اچھی گرفت ہے، اس لیے ان کے ترجموں میں معنوی گہرائی اور روانی پائی جاتی ہے۔
انہوں نے متن کے مفہوم کو درست طریقے سے منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ منٹو کے اسلوب کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش

کی ہے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ ان کی یہ کاوش بلوچی میں ترجمہ ادب کے فروغ میں ایک مثبت اضافہ ہے۔ منٹو کے متعدد افسانے بلوچی میں منتقل ہو چکے ہیں، تاہم ان کے کئی شاہکار اب بھی ترجمے کے منتظر ہیں۔ بلوچی میں ترجمہ ہونے والے ان کے نمایاں افسانوں میں نباہ کن ے (احمد علی ظفر)، اسلام زندگ بات (چراگ لاشاری)، ٹیپو سلطان ۽ مرگ (عزیز گبٹی)، گہتری (صادق گلوری)، پرشنگ (غوث بخش صابر)، مس اڑنا جیکسن (شعبہ کریم)، موجدین (عصاملگ)، شادو ۽ بنی آدم (فضل کریم نادر)، بے وفا (ارمان آوارانی، خورشید (خالد در محمد فدائی)، ونڈ (احمد علی ظفر)، کرامات (خالد فدائی)، ٹوبہ ٹیک سنگھ (بدل خان)، رشوت (نور خان بزنجو) ونڈ (بہرام گبٹی)، شیر آملگ (صادق مراد)، پھٹانستان (روف راز)، مسٹر حمیدہ (جاوید اسلم)، تماشہ (زریر آسکانی)، چم (رازق راج) اور دیگر شامل ہیں۔ یہ تراجم نہ صرف منٹو کی تخلیقی عظمت کو بلوچ قارئین تک پہنچانے کا ذریعہ بنے ہیں بلکہ بلوچی ادب میں ترجمہ کاری کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

نتائج:

سعادت حسن منٹو کا فن اردو فکشن میں اپنی انفرادیت، فکری جرات اور حقیقت نگاری کے باعث ایک منفرد اور مستحکم مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے بے باک اسلوب، نفسیاتی گہرائی اور سماجی صداقتوں کے بے لاگ اظہار کے ذریعے اردو ادب میں نئے رجحانات متعارف کروائے، جو آج بھی فکشن کی روایت میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے تخلیقی و فور نے انسانی فطرت کے پیچیدہ اور سفاک پہلوؤں کو بے نقاب کیا، جس سے ان کی تحریریں محض کہانی نہ رہیں، بلکہ سماجی، سیاسی اور نفسیاتی مطالعے کی دستاویزات بن گئیں۔ بلوچی ادب میں منٹو کے تراجم کا آغاز تاخیر سے ہوا، جس کے پیچھے کئی سماجی، نظریاتی اور ادبی عوامل کار فرما رہے۔ ابتدا میں ان کے فن کو نظر انداز کیے جانے کی ایک بڑی وجہ ان پر لگائے جانے والے الزامات اور ترقی پسند ادبی رجحانات کی وہ ترجیحات تھیں، جن میں مخصوص نظریاتی افسانہ نگاری کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ بلوچی مترجمین اور قارئین نے منٹو کے اسلوب کی جرات مندانہ سچائی اور ان کی کہانیوں میں پوشیدہ تہذیبی، معاشرتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو دریافت کیا، جس کے نتیجے میں ان کے تراجم کو پذیرائی حاصل ہوئی۔

تاہم، ان تراجم کے معیار میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ بعض مترجمین نے ان کے اسلوب اور فکری جہتوں کو خوبصورتی سے منتقل کیا، جبکہ کچھ تراجم میں سطحی اور لفظی ترجمے کی جھلک نمایاں رہی، جس کے باعث منٹو کی تحریروں کی وہ شدت، تہہ داری اور معنویت مکمل طور پر منتقل نہ ہو سکی۔ تخلیقی ترجمہ محض زبان کی تبدیلی کا عمل نہیں، بلکہ اصل متن کے فکری، جمالیاتی اور اسلوبیاتی جوہر کو نئی زبان میں زندہ رکھنے کا عمل ہے، جو ایک نازک اور پیچیدہ فنی کاوش کا متقاضی ہوتا ہے۔

مستقبل میں، ضروری ہے کہ منٹو کے افسانوں کے تراجم کو محض لغوی سطح پر نہ دیکھا جائے، بلکہ ان کے بیانیے، اسلوبیاتی ندرت

اور تہذیبی معنویت کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے اعلیٰ معیار کے وفادار تراجم کیے جائیں۔ اس سے نہ صرف بلوچی ادب میں عالمی معیار کے فلشن کے ترجمے کا رجحان مستحکم ہوگا، بلکہ بلوچی قارئین کو بھی ایک بڑے تخلیقی ذہن کے افکار اور اس کے فن کے جوہر تک حقیقی رسائی حاصل ہو سکے گی۔

حوالہ جات

- ۱۔ بگٹی، عزیز احمد، مزوری، (ترجمہ) ماہنامہ اُلس، جنوری، ۱۹۷۷
- ۲۔ بگٹی، عزیز احمد، ٹیپو سلطان، مرگ (ترجمہ)، ماہنامہ اُلس، فروری، ۱۹۷۷
- ۳۔ بگٹی، عزیز، بوڑ، (ترجمہ)، تراتانی کشار، کوئٹہ: بلوچی اکیڈمی، ۲۰۱۲
- ۴۔ طاہرہ اقبال، ۲۰۰۲، منٹو کا اسلوب، لاہور: فلشن ہاؤس، ۲۰۰۲، ص، ۱۲۵
- ۵۔ عبد الرحمن، رانا، سعادت حسن منٹو (مرتب)، لاہور: بک ہوم، ۲۰۱۲
- ۶۔ بگٹی، عزیز احمد، نوزغ غام، کوئٹہ: قلات پبلشرز، ۱۹۸۱
- ۷۔ اقبال، زاہد، منٹو کے شاہکار افسانے، (مرتب)، کراچی: اسلامک بک سینٹر
- ۸۔ احمد، بشیر، برپین جون، (ترجمہ)، بشیر بلوچ، کوئٹہ: ماہنامہ بلوچی
- ۹۔ بابی، گوہر اقبال، سردیں گوشت (ترجمہ)، پسنی: سسے ماہی روچ، شمارہ، ۷
- ۱۰۔ بلوچ، علی، ۱۹۸۵ (ماہیگ کش (ترجمہ)، میگزین سنچ، کراچی: سید ہاشمی اکیڈمی، ۱۹۸۵
- ۱۱۔ گنجی، گلزار، آپٹک (ترجمہ)، کوئٹہ: ماہنامہ بلوچی، اپریل، ۱۹۹۲
- ۱۲۔ گنجی، گلزار، ہید (ترجمہ)، کوئٹہ: ماہنامہ بلوچی، فروری، ۱۹۹۶
- ۱۳۔ گنجی، گلزار، پلانی پنڈل (ترجمہ)، کوئٹہ: ماہنامہ بلوچی، اگست، ۱۹۹۳
- ۱۴۔ عبد الرحمن، رانا، سعادت حسن منٹو، (مرتب)، لاہور: بک ہوم، ۲۰۱۲
- ۱۵۔ داد، آے۔ آر، چم (ترجمہ)، ماہنامہ آساپ، اپریل، ۱۹۹۳